

بنیادِ تمدن

از جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریادادی

فرنگستان کے موجودہ سیاسی مفکرین میں ایک ممتاز نام آکسفورڈ کے جوزف ٹوہنی کا ہے۔ اجتماعی و تمدنی مباحث پر متعدد تصانیف کے مصنف ہیں، اور قوم و نسل کے علمی مسائل پر ایک ماہر خصوصی سمجھے جاتے ہیں (Encyclopaedia of Religions and Ethics) ادیان و اخلاقیات کے دائرۃ المعارف کی ضخیم و مستند مجلدات میں عنوان "نسل" (Race) پر مبسوط مقالہ انہیں کے قلم سے ہے۔ مقالہ کے اندر ہر صاحب فکر کے لیے بہت سی بصیرتیں موجود ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ قرون وسطیٰ میں جب رومی یا لاطینی کلیسا نے مسیحیت کی مادی شروع کی تو عالم انسانیت کو کل دو حصوں میں تقسیم کیا۔ مسیحی اور غیر مسیحی۔ مسیحی تو وہ جو فی الواقع اور فی الحال مسیحی ہیں، اور غیر مسیحیوں کی تعبیر اس نے یوں کی، کہ بالفعل نہ سہی، بالقوة تو یہ بھی مسیحی ہیں۔ یعنی گو اس وقت منکر ہیں۔ لیکن صلاحیت تو بہر حال ان سب میں قبول مسیحیت کی موجود ہے، اور تبلیغ کے اثر سے ان کا مسیحی ہو جانا دائرۃ امکان میں ہے۔ ان کے اور مسیحیوں کے درمیان کوئی ابدی تغیر قائم نہیں، کوئی دائمی و لازوال حجاب نہیں۔ چنانچہ جو جو تو میں مسیحیت قبول کرتی گئیں، اپنے پیش رو مسیحیوں کی معاشرتی و اعتقادی زندگی اختیار کرتی گئیں۔ ان کے اور قدیم مسیحیوں کے درمیان کوئی فرق کسی قسم کا قائم نہ ہوا۔

ہوتے ہوئے اصلح کلیسا کا زمانہ آیا۔ قدیم کیتھولک مذہب، اور پاپائے روم کے خلاف

بغاوت شروع ہوئی، اور مارٹن لوتھر کے اثر سے پروٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا۔ اب اہل یورپ کے فتوحات کا رقبہ وسیع ہوا، اور بحری ترقیوں کی بنا پر ایسی نئی نئی قوموں سے سابقہ پڑنا شروع ہوا جو اپنی شکل و شمائل میں یورپ اور مغربی ایشیا کے باشندوں سے بالکل مختلف تھیں۔ ان کی جلد کا رنگ، یورپ والوں کے رنگ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ ان کے تمدن و معاشرت کے ناپنے کے لیے کوئی پیمانہ ہی یورپ میں نہ تھا۔ آب و ہوا ان کے ملکوں کی، یورپ کے ملک سے بالکل مختلف تھی۔ یہ نیا تجربہ یورپ والوں کے لیے ایسا ہی تھا، جیسا اہل یونان کو اول اول مصر سے سابقہ پڑنے پر پیش آیا تھا۔ لیکن یورپ کے دماغ نے اس سے جو اثر قبول کیا، وہ اس کے بالکل مختلف رہا، جو اہل یونان کے دماغ نے اپنے زمانہ میں قبول کیا تھا۔

یونانیوں نے استدلال یوں کیا تھا، کہ باشندوں میں اگر اس قدر اختلاف ہے، تو خود ان ملکوں میں بھی تو اسی قدر اختلاف موجود ہے، اور اس لیے انسان کے لطو اہر کا یہ سارا اختلاف نتیجہ ہے اختلاف ماحول کا، ورنہ حقیقت انسانی ہر جگہ یکساں ہے۔ جو جوں ماحول میں خیرات ہوتے رہتے ہیں، اسی نسبت سے خواص بشری میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے، اور شدید سے شدید اختلافات کے عقب میں بھی بہر حال ایک وحدت کا وجود ہے۔ اہل یورپ پر اس کے برعکس، اپنے نئے سابقہ دلائل کی اجنبیت کا دہرا کا ایسا بیٹھا کہ اس کھلی ہوئی توجیہ، یعنی اختلاف ماحول کی طرف ان کا ذہن ہی نہ منتقل ہوا، نہ اس امر کی طرف کہ تمدن و معاشرت کے اختلاف کا ہر بڑے سے بڑا منظر بھی بہر حال تدریج ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پس لطو اہر کے اختلافات سے وہ ایسے متحیر و مبہوت ہوئے کہ عوارض کو اصل قرار دے لیا، اور لطو اہر کو حقیقت کی جگہ پر رکھ دیا۔ ان کے ذہن میں صورت استدلال یوں آئی کہ یہ تو ممکن ہے، جیسی، مسیحی مذہب قبول کرے، لباس اور معاشرت بھی یورپی اختیار کرے، لیکن اپنے رنگ کو کیا کرے گا، یہ تو بہر حال اس کے اختیار کی چیز نہیں۔ گورا،

زندگی بھر گورا ہی رہے گا، اور کالامدۃ العمر کالا۔

یہ اختلاف رنگ کی لاہیت یورپین دماغ پر اس درجہ مسلط ہوئی کہ اس کا مطلق کوئی صل اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور رنگ کو گویا مستقل نوعی اختلاف کی بنیاد قرار دیکر اُس نے انسانیت کی تقسیم مہذب و غیر مہذب و دھول میں کر دی۔ اب نئے نظریہ کے مطابق دنیا کی آبادی مسیحی و غیر مسیحی میں تقسیم نہ رہی۔ بلکہ اب دو صنفیں، گوری قوموں اور کالی قوموں کی قرار پائیں جن میں سے ایک کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اپنے ارادہ سے، اپنے اختیار سے، کام لے کر دوسری میں داخل ہو سکے۔ اس تقسیم کے بعد، خود یورپ کی ذہنیت بھی غیر متاثر نہ رہی۔ اور جس طرح یونانیوں کے اس نظریہ کے بعد کہ مصریوں کا مختلف تمدن، مختلف ماحول کا نتیجہ ہے، خود یونانیوں میں قومی عصبیت ہلکی پڑ گئی تھی، اور اس کی جگہ نرمی، فراخ دلی، اور واداری زیادہ پیدا ہو گئی تھی۔ اسی طرح یورپ کی ذہنیت پر، اس گوری اور کالی انسانیت کی ناقابل اتصال و ناقابل انقیام تفریق کا اثر یہ پڑا، کہ اس کی قومی اور نسلی عصبیت اور زیادہ گہری ہو گئی، اور غیر یورپی قوموں سے اختلاف کا امکان ہی جاتا رہا۔

یہاں تک مقالہ شکار کے مطالب اپنی زبان میں ادا کر دے گئے، آگے جو کچھ آ رہا ہے، اس کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے، کہ عبارت بھی حتی الامکان، مقالہ شکار ہی کی قائم رہے۔ ترجمہ فعلی اب بھی نہ ہو گا لیکن بہر حال ترجمہ ہو گا۔

”مسیحی دنیا ایک زمانہ میں اپنے اندر جو اندرونی اتحاد اور بیرونی قوت جاذبہ

رکھتی تھی اس کا صحیح اندازہ، موجودہ اسلامی دنیا سے موازنہ کرنے سے ہو سکتا ہے،

اسلام جو مسیحیت ہی کی ایک ادنیٰ درجہ کی نقل ہے، اور نشوونما بھی جس کا بہت دیریں

ہوا، مغربی افریقہ ہو یا ہندوستان، مسیحی مبلغ سے بڑھ کر عملی کامیابی حاصل کر لیتا

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان مبلغ، نو مسلموں کو حقیقتاً اپنے طبقہ میں شامل کر لیتا ہے، معاشرت میں ان سے برابری کا برتاؤ کرتا ہے، اور اپنی لڑکیوں کو انھیں بیاہ دیتا ہے۔ اس کے برعکس یورپی مبلغ، اسی تفریق رنگ کی بنا پر ”دیسی“ مسیحیوں سے بڑی اجنبی و بیگانہ رہتا ہے، جیسا کہ غیر مسیحی کافروں سے، اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک ”دیسی“ کلیسا کا انتظام کر سکتا ہے، یورپی آبادی سے بالکل خارج۔

یہ آخری خط کشیدہ فقرے خدا جانے ڈاکٹر اسد کار اور دوسرے اچھوتوں کی نظر سے بھی کبھی گزر رہے ہیں، جو اپنی پستی اور ذلت کا احساس کر کے ایک نئے دین کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں۔ یاد رہے کہ ابتدائی غیر خط کشیدہ فقروں کی طرح یہ عبارت ایک یورپی مسیحی کے قلم سے ہے جس کا رشتہ الملام کے ساتھ دوستی کا نہیں دشمنی کا ہے۔ اب آگے جو کچھ ہے، وہ مسلمانوں کے خوش ہونے کے لیے نہیں، عبرت و نصیحت حاصل کرنے اور غور کرنے کے لیے ہے۔

”البتہ یہ ملحوظ رہے کہ جو مسلمان آبادیاں یورپی تمدن کی سطح کے قریب ترین آچکی ہیں، خود وہ بھی اپنی اسلامی (پان سلاٹک) اخوت کو ختم کرتی جاتی، اور یورپیوں کی وہ قومیت اختیار کرتی جاتی ہیں جس کی بنیاد وحدت لسانی پر ہے۔ چنانچہ شام کے عربوں میں اس جذبہ قومیت کا حال یہ نکلا کہ ان کے، اور ایرانیوں اور ترکی زبان بولنے والے مسلمانوں کے درمیان منائرت قائم ہو گئی۔ اور اس نقصان کی کافی یوں ہوئی کہ عربی زبان بولنے والے مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان منائرت کا حجاب اٹھ گیا۔ اور عثمانی ترکوں میں جو قومیت نوپا رہی ہے۔ وہ خالص افراتی قسم کی ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء کے قبل تک، سلطنت عثمانیہ میں،

لے واضح رہے کہ مقالہ مصطفیٰ اکمال کے دور سے قبل کا لکھا ہوا ہے۔

تو دن وپلی کے سچی مالک کی طرح، برسرِ اقتدار وہ طبقہ تھا، جو اپنے میں لمجا ظ حقوق، شمار و شامل اپنے ملک کے اُن سارے لوگوں کو کر رہا تھا، جو اس کے ہم مذہب ہوں، خواہ یہ ہم مذہبی ارثاً حاصل ہو یا حال میں بذریعہ تبلیغ۔ نوجوان ترک پارٹی جب برسرِ اقتدار ہوئی، تو اُسے اس اخوتِ اسلامی کے بجائے عثمانیت کا پروگرام پیش کیا یعنی اشتراک کی بنیاد بجائے مذہبِ اسلام کے ترکی زبان کو قرار دیا۔ اور عثمانی مدو ملک سے ان تمام لوگوں کو نکالنا شروع کر دیا۔ جن میں عثمانیت نہ طوعاً پیدا ہو سکی، نہ کرہاً۔

عُجبِ یورپ کے دوران میں ترکی میں، جو نسلی مقدمات چلے وہ جس طرح اذینی مسیحیوں کے خلاف تھے اسی طرح عرب مسلمانوں کے خلاف بھی تھے۔ اور گوارمنوں کو حسب دستور قید اب بھی اسلام قبول کرنے کا موقع دیا جاتا رہا۔ لیکن اب اسلام قبول کرنے کے بعد ہونے یہ لگا، کہ اگر وہ عورتوں اور بچوں کے حصّہ چند افراد ہوتے تو انہیں ترکی خاندانوں کے حوالہ کر دیا جاتا، اور اگر پورے گاؤں یا قصبوں کی آبادیاں ہوتیں تو ان کے ساتھ بھی اسی سختی کا برتاؤ رہتا جس طرح اسلام نہ قبول کرنے والوں کے ساتھ۔ یہ پوری پوری آبادیاں اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اپنی زبانِ قدیم قائم رکھتیں، جیسا کہ ہوسینا کے سلافی نسل دہے، اپنی علیحدہ زبان (جب سے پندرہویں صدی میں سب کے سب مسلمان ہو گئے) اب تک رکھتے چلے آئے ہیں۔ وحدتِ دینی جو اشتراکِ معاشری کی بنیاد آباد و اجداد کے وقت سے چلی آتی تھی، اس سے نوجوان ترکوں کو کوئی غرض ہی نہ تھی جب کہ وہ وحدتِ دینی، اختلافِ فلو اہر کو نہ مٹا سکے جو جدید اور نادرک قومی احساس کے لیے سب سے بڑھ کر تکلیف دہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد مقالہ نثارِ آخر میں دو سوالات پیش کرتا ہے۔

۴ موجودہ احساس قومی کے اس تاریخی ارتقاء کے بعد ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سب سے زیادہ ترقی پذیر مسلم آبادیوں نے آخر اس قومیت کا اثر کیوں اتنا زیادہ قبول کر لیا ہے، جو حقیقتہً ایک تنزلی تحریک ہے؟ اور اگر اس کا سبب تقلید یورپ کو قرار دیا جائے تو پھر یورپ، قرونِ مظلمہ سے لے کر اب تک کیسے ایسی سلسل ترقی، اس انحطاط انگیز تحریک کے باوجود، کرنا چلا جا رہا ہے؟

مقالہ نگار نے جواب جو کچھ دیا ہو، اس سے یہاں غرض نہیں۔ سوال تو آپ کے سوچنے کا ہے۔ کیا آپ کے قرآن نے آپ کو یہ پیام نہیں سنا دیا تھا کہ۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ الَّذِي خَلَقَكُمْ
مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ۔ (نار۔ ۱۴)

اور جس نے پھر اسی حقیقت کو یوں ظاہر کیا تھا کہ
هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ
وہ پروردگار وہی تو ہے، جس نے تم (سب) کو پیدا
کر دیا ایک ہی شخص سے۔ (انعام، ۱۱)

اور پھر اسی پیام کو یوں یاد دلایا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ
وہ خدام ہی ہے جس نے تم (سب) کو پیدا کیا
ایک ہی شخص سے۔ (احراف ۲۲۶)

۵ ترجمان القرآن بظن یہ ہے کہ مسلمان تو اسلام سے بہت کرسلی، خیرانی اورسانی قومیتوں کا سبق کچھ رہے ہیں۔ اور یورپ میں اب اس قومیت کا آفتاب غروب ہو رہا ہے آج یورپ میں زبان اور خون اور رنگ کی وحدت کے بجائے ایک مسلم اور ایک غفل کی وحدت پر قومیت کی بنیادیں رکھی جا رہی ہیں۔ ایک طرف اشتراکی نظام کو مٹانے والے ایک قوم بن رہے ہیں۔ دوسری طرف فاشزم پر ایمان رکھنے والے ایک دوسری قوم بن رہے ہیں۔ شمالی مشرقی قسمن کھائی کے بن جن کر ڈے نواہوں کو اہل مغرب تھوکتے جائیں گے انہیں کو یہ لپک لپک کر مذہب لکھتے جائیں گے

اور پھر فرمایا :-

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (زمزم) پیدا کیا تم (سب) کو ایک ہی جان سے۔

اور کیا قرآن نے ایک آدمہ بار نہیں دس ہیں بار یا ایھا الناس کا خطاب دوہرا کر یہ حقیقت واضح نہیں کر دی ہے، کہ تمام نوع انسان، اصلاً ایک ہے، وحدت انسانی، اساسی و فطری ہے جزا سانی، نسلی، لونی، ساری تعلیمات محض فرعی و قسمی ہیں۔ اچھے، اور بُرے، مکھرے اور کھوٹے جو کچھ ہیں، وہ عقائد و اعمال کی بنا پر ہیں جو تمام تر اپنے اختیار و ارادہ کی چلیر ہیں، نہ کہ فلاں خاندان میں، فلاں سر زمین پر، فلاں ملک میں، پیدا ہو جانے کی بنا پر، جو انسان کے اپنے ارادہ و اختیار سے تمام تر بنا رہے ہیں۔

اسلام کے قبل دنیا تو مختلف مٹھریوں میں بٹی ہوئی تھی ہی، حد یہ ہے کہ دیوتا اور خدا تک بہر شہر اور صلیح کے دوسری جگہ سے الگ تھے یہود جو موجد تھے، ان تک نے باوجود دعوائے توحید کے خدا کی خدائی کو صرف بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص کر لیا تھا، اور رب موسیٰ گویا صرف رب قوم بنی تھا۔ یہ تخیل تو اسلام ہی نے اُکڑ مٹایا۔ اسلام ہی نے رب العالمین کا عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ سب کو وحدت عقیدہ کی طرف بلایا۔ اور دنیا کی تقسیم صرف وہی حصوں میں رکھی۔ پیغام کو قبول کرنے والے اور نہ قبول کرنے والے۔

خدا کا غضب ہے کہ خود مسلمان ہی اس خدائی تعریف کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں، اور پھر اس کی جگہ وہ مشرک قوموں والی، دور جاہلیت والی، ذات پات والی، چھوت چھات والی تقسیم قائم کرنا چاہتے ہیں۔ شاندار ناموں کی آڑ میں بڑے بڑے القاب کو سپر بنا کر۔ اور یہ بھی اس وقت جب خود یورپ اپنی تکی ہوئی راہ سے عاجز آچلا ہے اور خود اپنے پیروں سے ان بیڑیوں کو کاٹنا چاہ رہا ہے۔ علامہ اسے اس پر قدرت مہیا نہ ہو، یہ الگ سوال ہے۔ باقی اس کے سوچنے والے دماغ سوچ تو اب بھی رہے ہیں۔ (ماخوذ از اصدقا)